جواب حاضر ہے۔۔۔((1

مستقبل

فرخ سہیل گوئندی

04–02–2013

یہ بات درست ہے کہ اپنے بارے میں لکھنا ایک مشکل کام ہے لیکن آج مجھے یہی مشکل کام کرنا ہے۔ اس کی وجہ میرے گزشتہ کالم ''چڑیا لائی اقتدار کا ہما'' کے بعد ہمارے اخبار کے گروپ ایڈیٹر محترم عطاالرحمن صاحب کے 31 مارچ کے کالم ''مشرف کے ذہنی پیروکار'' میں اٹھائے گئے نکات اور تحریر کیے گئے حقائق کی درستی مطمع نظر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں موضوع کی طرف آؤں، میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ میرا قلم سے تعلق چڑھتی جوانی کے ایام سے ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں ایسی تحریروں پر کم از کم چودہ سال قید اور دس کوڑوں کی سزا کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔ راقم اس وقت ٹین ایجر تھا۔ قلمی جدوجہد کے آغاز میں جریدے ''صدائے وطن'' میں میرے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ''جہادِ افغانستان'' کے علمبردار جنرل ضیاالحق کے خفیہ والے راقم کی تلاش میں عقوبت خانوں میں رونگٹے کھڑا کر دینے والے تشدد کے دوران، تفتیش کرتے تھے کہ بتاؤ قلمی نام۔۔۔ کا یہ شخص کون ہے؟ اور پھر اس ''صدائے وطن'' کا شمارہ بعنوان ''عید کا تحفہ کیا چاہیے، جنرل ضیا کا سر چاہیے'' ستمبر 1979ء کا آخری شمارہ شائع ہوا۔ اس کے بعد راقم، کراچی، پشاور، لاہور، کوئٹہ، ملتان، حیدرآباد، لائل پور اور دیگر شہروں سے ہاتھوں سے لکھے گئے اور اس کی سائیکلوسٹائل کاپیوں کی شکل میں شائع کردہ جریدے کا متحرک ترین قلمکار تھا جو پاکستان میں جمہوریت اور آئین کی بحالی اور آمریت کے خاتمے کی جدوجہد میں عشق کی حد تک شامل تھا۔ یہ صحافت پاپولر جرنلزم نہیں بلکہ مزاحمت کی صحافت کہلاتی ہے، جس کا کوئی معاوضہ ہوتا ہے نہ کوئی شہرت۔ میرے بھائی محترم عطاالرحمن صاحب اس وقت شاید ''جمہوری جدوجہد'' سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ انہی دنوں بھارت کے معروف کالم نگار، دانشور، فلمساز اور کہانی نویس خواجہ احمد عباس نے بھارت کے سب سے لمبے عرصے تک شائع ہونے والے اپنے کالم "The Last Page" جو جریدے ''بلٹز بمبئی'' سے شائع ہوتا تھا، راقم پر ایک کالم بعنوان "A Kafir from the Land of Pure" لکھا، جس میں میرا حلیہ بدل کر پیش کیا گیا تھا کہ اگر ''جہاد افغانستان'' کے علمبردار آمر جنرل ضیاالحق کی خفیہ والوں کو علم ہو جاتا تو اس کی سزا بھی چودہ سال قید بامشقت دے دی جاتی۔ یہ کالم خواجہ احمد عباس سے ایک مکالمے کے نتیجے میں لکھا گیا تھا جس میں راقم نے عرض کیا کہ ہم جمہوریت کی بحالی کے لیے انقلابی طرز کی جدوجہد میں شامل ہیں۔ محترم عطاالرحمن صاحب چوں کہ جمہوریت کے معاملے میں بڑے حساس ہیں، یقیناً ان کو یاد ہوگا کہ ان کے مربی میاں نواز شریف اس وقت کن صفوں میں کھڑے تھے۔ میں نہیں چاہتا کہ حالیہ تاریخ کے اس سیاہ باب اور اس کے خلاف چلنے والی اس مزاحمتی تحریک کی تفصیل میں جاؤں کیوں کہ ان گیارہ سالہ آمریت کے دوران برپا جدوجہد کے لیے یہ صفحات نہایت قلیل ہیں۔

مجھے جناب عطاالرحمن صاحب کے ساتھ دوستی پر فخر ہے کہ وہ ایک شان دار اور شفاف شخصیت کے انسان ہیں اور ہمارے زوال پذیر معاشرے میں میرے نزدیک یہ سب سے اعلیٰ خوبی ہے۔ میں چوں کہ نظریات کو دوستی اور تعلق میں غالب نہیں آنے دیتا، اس لیے محترم عطاالرحمن صاحب کے ساتھ میری دوستی تیسری دہائی میں داخل ہو چکی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے نظریات سے متفق ہوں۔ البتہ حقائق اور نظریات میں فرق ہے، حقائق بدلے نہیں جا سکتے۔ میرے برادرم عزیز نے اپنا کالم لکھتے ہوئے یہ یقین کر لیا کہ میں نے اپنا کالم ''چڑیا لائی

اقتدار کا ہما'' شاید ان کے ایک روز قبل شائع ہونے والے کالم کے جواب طور پر لکھا ہے۔ حالاں کہ میں نے اپنا کالم دائیں بازو کی سوچ رکھنے والے تمام اہل قلم دوستوں کے تجزیات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا جو کہ انہوں محترم نجم سیٹھی صاحب کے نگران وزیر اعلیٰ نامزد ہونے پر لکھے۔ خصوصاً روزنامہ ''ایکسپریس'' کے سینئر تجزیہ نگار جناب جاوید چودھری جنہوں نے جلدی میں اکٹھی کی گئی معلومات پر مبنی اپنے 28 مارچ کے کالم ''سیاست کا دل کھل رہا ہے'' میں نجم سیٹھی کی نواز شریف میں گرفتاری کا سبب "From Jinnah to Zia" کی کتاب لکھنے کا حوالہ دیا۔ موصوف نے تردد بھی نہ کیا کہ وہ کتاب کو گوگل سے تلاش کر لیتے تو مصنف کا نام بھی معلوم ہو جاتا اور یہ بھی معلوم کر لیتے کہ نجم سیٹھی کیوں گرفتار کیے گئے۔ موصوف اکثر اوقات جلدی میں اکٹھی کی گئی معلومات کی بنیاد پر ایسی تحریریں شائع کرواتے رہتے ہیں۔ جنرل مشرف چوں کہ جنرل ضیا الحق کے برعکس روشن خیالی کا دعویٰ کرتے تھے، اس لیے پاکستان کا جہادی نقطہ نظر رکھنے والا طبقہ جنرل مشرف کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور جنرل ضیا کی آمریت پر تنقید سے اجتناب برتتا ہے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں جرنیل ایک ہی عالمی طاقت کی سرپرستی میں ہم پر مسلط کیے گئے اور اگر جنرل مشرف کو ان کے آقا خطے میں جہادی مؤقف کی لائن دیتے تو انہوں اس مؤقف کو اپنانے میں انکار نہیں کرنا تھا اور ایسے ہی جنرل ضیاالحق کو اگر امریکی آقا خطے میں روشن خیالی کی لائن دیتے تو جنرل ضیاالحق بھی اسی آقا کے سامنے انکار نہ کرتے۔ چوں کہ دونوں جرنیل آمر بھی تھے اور امریکہ کے اتحادی بھی، اس لیے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ راقم 2003ء میں ایک سیمینار میں شرکت کے بعد امریکی کانگریس کے برآمدے میں کھڑا ایک امریکی ٹی وی کو انٹرویو دے رہا تھا۔ ان دنوں جنرل پرویز مشرف، امریکی آنکھوں کا تارا تھے۔ صحافی نے مجھ سے سوال کیا:

"General Pervaiz is a secular leader?"

میں نے اس کے تین بار اٹھائے گئے سوال کا ایک ہی جواب دیا :

"He is a secular dictator not a leader."

یقیناً یہ خاتون صحافی جس جواب کی خواہاں تھی وہ اسے نہیں مل پایا تھا۔ جنرل پرویز مشرف اقتدار پر غاصبانہ قبضے کے بعد سیکولر ترکی چلے گئے۔ ان دنوں ترکی میں وزیر اعظم بلند ایجوت تھے، انہوں نے میرے ساتھ بیس سالہ دوستی میں جو اعتماد مجھ پر کیا، وہ میرے لیے سرمایۂ حیات اور صیغۂ راز بھی ہے کہ دوستی کے ان ماہ و سال میں راقم نے اپنے وطن کے لیے جو کیا اس کا صلہ تو درکنار، میں اس کے ذکر سے بھی اجتناب برتتا ہوں۔ ''روشن خیال'' ڈکٹیٹر جنرل پرویز مشرف کو یقین تھا کہ وہ ترکی کی حمایت حاصل کر لیں گے۔ لیکن مجھے اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ جب جنرل مشرف نے ترکی جانے کا اعلان کیا، وزیر اعظم ترکی جناب بلند ایجوت نے راقم کو فون کیا اور اس حوالے سے مشورہ کیا۔ یقیناً راقم ایک فوجی ڈکٹیٹر کو کیسے سپورٹ کرنے کا مشورہ دے سکتا تھا اور پھر جب جنرل پرویز مشرف، انقرہ اترے تو ان کو دفتر خارجہ کے ایک نمائندے نے ریسیو کیا۔ ملاقات کے دوران بلند ایجوت نے ''روشن خیال ڈکٹیٹر'' کو کہا کہ میں آپ کی تین شرائط پر سپورٹ کر سکتا ہے:

1- جمہوریت کی بحالی تین ماہ میں انتخابات کے ذریعے یقینی بنائی جائے۔

2- جاگیرداری کا خاتمہ۔

3- تعلیم کی انقلابی اصلاحات و اقدامات۔

جناب بلند ایجوت جو کہ بائیں بازو کے رہنما تھے اور ان کی جماعت کا نام "Democratic Left Party" تھا، نے کہا کہ ہم دونوں، وزیر اعظم اور صدر سلیمان ڈیمرل، جرنیلوں کے Victims ہیں، ہم کیسے ایک فوجی حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں۔ بلند ایجوت اور جنرل پرویز مشرف کی ملاقات کے چند روز بعد وزیر اعظم ترکی جناب بلند ایجوت نے وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں راقم کے ساتھ پچاس منٹ طویل ملاقات کی اور بار بار استفسار کیا کہ کہیں جنرل پرویز مشرف، جنرل ضیاالحق کی طرح میاں نواز شریف کو سزائے موت تو نہیں ہونے دیں گے۔ راقم نے کہا کہ ایسا ممکن تو نہیں، لیکن اگر آپ جنرل مشرف پر اپنے ذرائع سے دباؤ ڈالیں تو یہ پاکستان کے لیے بہت بہتر ہوگا۔ اس کی تفصیل میری آئندہ کتاب میں شائع ہوگی۔ راقم، میاں نواز شریف کا کبھی مداح اور ساتھی نہیں رہا لیکن مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میرے کہنے پر ترکی جیسے اہم ملک کے وزیر اعظم نے ''روشن خیال فوجی ڈکٹیٹر'' پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کے ماضی کے تجربات سے سبق سیکھے اور کسی انتہائی اقدام

سے اجتناب برتے۔ اس ملاقات کے بعد محترم مشاہد حسین کی رہائی کے لیے راقم کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور یوں مشاہد صاحب اور ان کے دوسرے دوست بعد میں رِہا کر دیئے گئے۔ اس کے گواہ جناب مشاہد حسین کے والد گرامی کرنل امجد صاحب ہیں۔ عطا صاحب! میں نہ ہی میاں برادران کی محبت کا اسیر ہوں اور نہ ہی مجھے صرف ان کی شکل میں جمہوریت کا چہرہ نظر آتا ہے، میرے لیے ایک اہم تر نظریہ انسانیت اور انصاف ہے۔ میں میاں برادران سے کسی داد کا خواہش مند بھی نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی ان تک کبھی یہ خبر پہنچائی۔ جب تک بلند ایجوت وزیر اعظم اور میاں برادران پابند سلاسل رہے، راقم کی کوشش صرف یہ رہی کہ پاکستان میں 4 اپریل 1979ء کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔ عطاء الرحمن صاحب! اور آپ نے یہ کیوں یقین کر لیا کہ اس وطن عزیز میں صرف آپ کی سینئر تجزیہ نگار ہیں، ماشاء اللہ چند سالوں کے اندر اب ہر کوئی سینئر تجزیہ نگار بن چکا ہے اور ہر کوئی سیاسی تجزیہ نگاری کے بازار میں اپنا مال بیچ رہا ہے۔ خصوصاً ''جنگجو صفت سینئر تجزیہ نگار''، شاعر، ادیب، مزاح نگار، افسانہ نگار، فلموں کی کہانی لکھنے والے اور نہ جانے کون کون سب سیاست پر ''بھرپور تجزیے'' کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب تھیٹر کے اداکار، تجزیہ نگار بھی ہیں اور کالم نگار بھی۔ (جاری ہے)